ڈاکٹر نسیم عباس احمر*

# میرزا ادیب اور بچوں کا ادب _____ تجزیاتی مطالعہ

## (کہانیوں اور ڈراموں کے حوالے سے)

**Abstract:** *Meerza Adeeb is a great name of Urdu literature. He didn't write only for adults but wrote stories, novels, dramas and biographies of world's renowned personalities for children as well. It is not easy to write children's literature because one must have deep interest to know about childern's activities, psychology and requirements according to their age. Meerza Adeeb is a keen observer and knows the art of writing for children. He inculcates good habits and trains them in a way, they don't feel imposed and find out the moral lesson naturally. This article is a critical analysis of Meerz Adeeb's children literature including short stories and dramas .*

میرزا ادیب نے جہاں بڑوں کے لیے ادب تخلیق کیا وہیں بچوں کے لیے بھی کثیر تعداد میں کتب لکھیں، جن میں کہانیاں، ناول، ڈرامے اور سوانح و سیرت پر مبنی کتب شامل ہیں جو تعداد اور معیار؛ ہر دو اعتبار سے بچوں کے ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ بچوں کا ادب، تخلیق کرتے ہوئے، جو بات عموماً کسی ادیب کے پیش نظر ہوتی ہے وہ اُن کا مقصدی و افادی پہلو ہے۔ وہ نفسیاتِ اطفال کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس بات کا پورا شعور رکھتے ہیں کہ بچہ براہِ راست، نصیحت قبول نہیں کرتا اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے تو اُس کی شخصیت میں باغی پن پیدا ہوتا ہے کیوں کہ وہ کسی بھی قسم کی زبردستی اور دباؤ کو برداشت نہیں کرتا لہٰذا وہ نصیحت کے کڑوے پن کو کہانی کے تانے بانے میں اس طرح ملا جلا کر پیش کرتے ہیں جیسے کونین کی گولی کو شہد میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے دراصل وہ بچوں کو اس نکتے پر لانے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے، ملک و قوم اور خاندان کے ساتھ جو حقوق و فرائض وابستہ ہیں، انھیں ان کا خیال رکھنا ہو گا۔ اس تناظر میں وہ بچوں کو معاشرتی و اخلاقی اقدار کا درس دیتے ہیں لیکن نصیحت براہِ راست کرنے کی بجائے صورت و بیان واقعہ کے وسیلے سے اپنی بات، بچوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ حق اور باطل کی آویزش پیش کرتے ہیں اور حق کی جیت کے ذریعے، بچوں تک کہانی کا مقصد پہنچاتے ہیں کیوں کہ وہ اس بات کو درست نہیں سمجھتے کہ کہانی کار، کہانی کے اختتام پر اخلاقی درس کی تلقین کرے کیوں کہ بچہ، تلقین یا نصیحت سننا پسند نہیں کرتا اور نصیحت کا شائبہ ہونے پر سمجھتا ہے کہ تخلیق کار اُسے کھینچ کر اپنی مقصدیت کے دائرے میں جکڑنا چاہتا ہے۔

میرزا ادیب نے بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے لکھے جن کا بنیادی مقصد بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اُن کے ڈراموں کی نوعیت پر غور کیا جائے تو ان میں اخلاقی و معاشرتی موضوعات کے ساتھ حب الوطنی اور ملی جذبات شامل ہیں۔ اخلاقی و معاشرتی اقدار کی ترویج کے تناظر میں لکھے گئے

*لیکچرار، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

ڈرامے، بنیادی طور پر ان کی کہانیوں کی ہی توسیعی صورت ہیں جب کہ وطن وملت سے محبت پر مبنی ڈرامے، اُن کے ڈرامائی سرمایے میں اہم اور نمایاں ترین مقام رکھتے ہیں۔ ایسے ڈراموں کے وسیلے سے وہ بچوں میں وطن اور قوم کے حوالے سے جذبات ابھارتے ہیں اور بہادری، شجاعت و دلیری کا درس دیتے ہیں۔ ایک اہم بات یہ کہ وہ تاریخ کے جھروکوں سے بہادر شخصیات کی دلیری اور حب الوطنی کے واقعات پیش کرتے ہیں تا کہ بچے ان عملی مثالوں سے سبق سیکھیں۔ ان شخصیات میں عرب و ترک اور ہندوستانی فوج کے سپہ سالار، حضرت محل، خالدہ ادیب خانم اور فاطمہ بنت عبد اللہ خاص طور پر اہم ہیں۔ ترکوں کی حب الوطنی اور شجاعت کے حوالے سے لکھے گئے ڈراموں میں "وطن کی محبت" اور "قومی فرض" اہم ڈرامے ہیں۔

ڈراما "وطن کی محبت" ایک ترک آفیسر کے گرد گھومتی ہے جسے امیر تیمور کی فوج جنگی قیدی بنا کر لاتی ہے۔ یہ آفیسر انتہائی محبِ قوم و وطن، دلیر، نڈر اور خوددار ہے۔ امیر تیمور کی فوج کے دو جرنیل؛ جاوید اور غیاث، اس کو ڈرانے اور اس کا سر جھکانے کی بہت کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کسی بھی طرح کے دباؤ میں نہیں آتا۔ وہ خدا کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ موت کا دن مقرر ہے، جب یہ لمحہ آئے گا تو میں ایک لمحہ بھی نہیں جی سکوں گا لہٰذا میری زندگی جرنیلوں کے رحم و کرم پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ترک آفیسر، حب الوطنی کا نمائندہ ہے۔ اپنے ان جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتا ہے

> "مجھے صرف یہ ہو گیا ہے کہ میں وطن پرست ہوں اور مجھے اپنے وطن کے ایک ایک ذرے سے محبت ہے میرا وطن میرے لیے عزت ہے، ننگ و ناموس ہے۔ میری زندگی ہے، میری زندگی کی ہر خوشی ہے۔"(۱)

جاوید اور غیاث، اس ترک افسر کو کبھی خوف زدہ کر کے اور کبھی انعام و کرام کا لالچ دے کر جھکنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن یہ افسر، اپنی خود داری اور قوم وملت کے لیے نیک جذبات ترک نہیں کرتا۔ امیر تیمور کو جب اس کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو وہ خود اس کے پاس جاتا ہے جو جنگی معاملات میں اصول پرستی کا قائل ہے۔ وہ بھی اس بہادر افسر کی بہادری اور گفتگو سے بہت متاثر ہوتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنا نام اور اپنے بارے میں کچھ بتائے۔ یہاں میرزا ادیب، ڈرامے میں انکشاف کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ وہ ترک افسر اپنی ٹوپی اُتار کر اپنی شناخت دیتا ہے۔ امیر تیمور کے سامنے ترک افسر، ایک لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے، جس کا نام حمیدہ بانو ہے۔ یہ لڑکی بوڑھے ترک سپاہی کی اکلوتی بیٹی ہے جو اپنے بہادر باپ کی تلوار کی وارث بنتی ہے بہت قلیل وقت میں ایسے جوہر دکھاتی ہے کہ افسر بن جاتی ہے۔ یہ سب سن کر امیر تیمور، اسے سلام پیش کرتا ہے اور کہتا ہے:

> "وطن سے محبت ہو تو ایسی ہو۔ شاباش! مرحبا! تم آزاد ہو، صرف تم ہی نہیں اس جنگ میں جتنے بھی ترک سپاہی گرفتار کر کے لائے گئے ہیں بالکل آزاد ہیں ہم بہادر قوم کی تہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ جو قوم اتنی بہادر، جرات مند اور وطن سے سچی محبت کرنے والی لڑکی پیدا کر سکتی ہے۔ وہ دنیا میں کبھی غلام نہیں بن سکتی۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت بھی غلام نہیں بنا سکتی۔"(۲)

مذکورہ ڈرامے کا انجام، حیرت انگیز انکشاف پر ہوتا ہے۔ حمیدہ بانو کا کردار، جہاں محب وطن اور خوددار افسر کے طور پر ملتا ہے وہیں امیر تیمور کی اصول پرستی، عالی ظرفی اور عالی حوصلگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مکالمے، تمام کرداروں کی حیثیت اور مرتبے کے مطابق ہیں اور جوش و جذبے سے بھرپور ہیں۔

یہی صورتِحال، میر زاادیب کے ڈرامے "قوم کی بیٹی" میں ملتی ہے۔ یہ، ترکی کی فرض شناس، بہادر، محبت وطن اور نڈر ماں بیٹی کی کہانی ہے جو نرس بن کر قوم کے مجاہدوں کی مرہم پٹی کرنے کی خواہش مند ہیں۔ فوزیہ اور اس کی ماں نرسنگ کی ٹریننگ کے لیے کرنل عارف کے پاس آتی ہیں۔ فوزیہ کی عمر محض تیرہ برس ہوتی ہے جس کے سبب اُس کی بھرتی ممکن نہیں اور ماں کو ادھیڑ عمری کے سبب نرسنگ کے لیے منتخب نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں اس بات کو بھی چھپاتی ہیں کہ وہ ماں بیٹی ہیں کیوں کہ نرسنگ کے لیے بھرتی ہونے کے لیے یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ ایک گھر سے صرف ایک عورت، منتخب ہو سکتی ہے۔ دونوں الگ الگ کرنل عارف کو مطمئن کر کے نرسنگ ٹیم کا حصہ بن جاتی ہیں۔ قوم کے مجاہدین کی خدمت سے سرشار یہ دونوں خواتین میدانِ جنگ میں مجاہدین کی مرہم پٹے کے لیے جاتی ہیں۔ خیمے میں زخمی سپاہی کی تیمارداری کے دوران ایک گولہ خیمے کے قریب گرتا ہے اور ماں زخمی ہو جاتی ہے۔ فوزیہ ماں کو سنبھالنے لگتی ہے تو ماں اُسے، زخمی سپاہی کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے لیے کہتی ہے۔ فوزیہ سپاہی کو محفوظ مقام پر چھوڑ کر واپس آتی ہے تو سب کچھ تباہ ہو چکا ہوتا ہے اور جب فوزیہ واپس آتی ہے تو کرنل عارف پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شہید ہونے والی ادھیڑ عمر عورت، فوزیہ کی ماں تھی۔ کرنل عارف ان دونوں کے جذبے کو سلام پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "بیٹی! آج زندگی میں پہلی بار میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آئے ہیں۔ آج میرا یہ یقین اور پختہ ہو گیا ہے کہ انگریز اور فرانسیسی ہی نہیں پورا یورپ مل کر بھی ترکوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جس قوم کے افراد قوم کی خاطر قربانی دینا جانتے ہوں وہ قوم ہمیشہ آزاد رہے گی۔ بیٹی! تیری اور تیری ماں کی قربانی آئندہ نسلیں یاد رکھیں گی اور اس پر فخر کریں گی۔ تیری ماں قوم کی ماں اور تو قوم کی بہادر بیٹی ہے۔ زندہ باد فوزیہ بیٹے۔ زندہ باد۔"(۳)

اس ڈرامے میں فوزیہ اور اس کی ماں کا جذبۂ حب الوطنی دیدنی ہے۔ کرنل عارف کے سامنے دونوں کے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ ہونا، ڈرامے کی المیاتی مگر حب الوطنی کے جذبے سے لبریز فضا کو مزید تیکھا بنا دیتا ہے۔

ڈراما "قومی فرض"، پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے آخری سال کی کہانی ہے جو ترکوں کی حب الوطنی اور بہادری کے موضوع پر مبنی ہے۔ ترکوں کی راہنما، خالدہ ادیب خانم، مصطفی کمال کے ساتھ مل کر انگریزوں کی مخالفت میں تحریک چلاتی ہیں جس کی وجہ سے انگریز انھیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں لیکن بہادر اور محب وطن تُرک باشندے، اپنی جان کا خیال کیے بغیر، اُن کی ہر طرح سے مدد کرتے ہوئے تحریک کو زندہ رکھتے ہیں۔ چالیس سالہ ہُوف، بہت سی مشکلات برداشت کرتے ہوئے خالدہ ادیبخانم کو کھانا پہنچاتا ہے۔ انگریزوں کا پہرہ بڑھ جاتا ہے تو وہ یہ ذمہ داری اپنے دس سالہ بیٹے کو دیتا ہے کہ اگر میں صبح کی اذان تک واپس نہ آیا تو سمجھ لینا کہ میں گرفتار ہو گیا ہوں اور اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکا۔ ایسے میں تمھیں کھانا لے کر ان کے پاس جانا ہو گا۔ سلیم، گولیوں کی بارش میں کھانا لے کر خالدہ ادیب خانم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ سلیم سے بہت متاثر ہوتی ہیں اور کہتی ہیں:

> "شاباش میرے نڈر بچے! جو وطن ایسے نڈر بچے پیدا کر سکتا ہے۔ وہ کبھی غلام نہیں رہ سکتا۔ ترکی آزاد تھا، ترکی آزاد رہے گا۔"(۴)

سلیم اور یوف، دونوں آزادی کی تحریک میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈرامے کے مکالمے؛ تمام کرداروں کی عمر، معاشرتی حیثیت اور مرتبے کے مطابق ہیں اور سلیم کے کردار کی صورت میں وہ نڈر، بہادر اور سچے محب وطن بچے کی مثال پیش کرتے ہیں۔

اٹلی کی فوجیں، جب بحیرہ روم عبور کر کے شمالی افریقہ کے اسلامی ملک طرابلس پر حملہ کرتی ہیں تو عرب اور ترک سپاہی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ میرزا ادیب کا ڈراما "فاطمہ بنت عبد اللہ" اسی تناظر میں لکھا گیا ڈراما ہے، جس کا مرکزی کردار عرب مسلمان لڑکی، فاطمہ ہے اور جو ابتدا میں ترک اور عرب سپاہیوں کی بندوقیں صاف کرتی ہے مگر میدانِ جنگ میں جانے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ اسی جذبے کے تحت حضرت امّ عمارہ کی مثالیں دیتی ہے کہ اُنھوں نے کس بہادری کے ساتھ جنگِ اُحد میں حضرت محمدؐ پر ہونے والے واروں کو روکا اور مشک بھر کر غازیوں کو پانی پلایا۔ وہ بھی حضرت امّ عمارہ کی طرح میدانِ جنگ میں سپاہیوں کو پانی پلانا چاہتی ہے لیکن اس کے ماں باپ اور تُرک سردار احمد غوری بک، اس کی کم سنی کے سبب اُسے اس بات کی اجازت نہیں دینا چاہتے لیکن اس کے جذبے اور جنون کے سامنے چُپ ہو جاتے ہیں اور میدانِ جنگ میں پانی پلانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ وہ میدانِ جنگ میں بہت بہادری اور تیزی سے سپاہیوں کو پانی پلاتی ہے۔ ہر طرف اس کی بہادری کی تعریفیں ہوتی ہیں کہ اتنی کم سنی میں ایسی بہادری، جرات اور بے باکی کبھی نہیں دیکھی۔ ماں باپ اس پر فخر کرتے ہیں۔ ڈرامے کا انجام المیہ صورت پیدا کرتا ہے۔ جب باپ فاطمہ کو خون میں تَربہ تَر لے کر آتا ہے اور مشکیزہ اسی طرح اس کی کمر سے بندھا ہوتا ہے۔ وطن کی خاطر اپنی اکلوتی بیٹی کی قربانی دینے کے باوجود اس کے والدین اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی شہید بچی کی پیشانی چومتے ہیں۔ اس موقع پر فاطمہ کے باپ عبد اللہ کے جملے، اُن کی قلبی کیفیت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں:

> "سارہ! تیرے گھر کا چراغ نہیں بجھا بلکہ ہمیشہ روشنی دینے والا چاند بن گیا ہے۔ آنے والی نسلیں ہماری بچی کو یاد رکھیں گی اور کہیں گی کہ فاطمہ بنت عبد اللہ، اسلام کی آبرو تھی۔ اس کم سن بچی نے جنگ کے میدان میں غازیوں اور مجاہدوں کی پیاس بجھائی تھی۔ کیا ہمارے لیے فخر کی بات نہیں ہے۔ رو نہیں سارہ! اللہ نے ہمیں بڑی عزت دی ہے۔ اس عزت کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"(۵)

میرزا ادیب نے اس ڈرامے میں ایک کم سن بچی کی شجاعت اور بہادری کو مثال بنا کر پیش کیا ہے تا کہ بچے اس مثال سے سبق سیکھیں۔ فاطمہ کے مکالمے؛ اس کی کم سنی اور جذبے کی صداقت کی عمدہ مثال ہیں۔ ماں کا کردار، روایتی محبت کے دائرے سے نکل کر شہید بیٹی کی صابر ماں کا روپ دھارتا ہے۔ باپ عبد اللہ کے مکالمے اُس کے کردار کی مضبوطی اور عمر کے مطابق ہیں۔ مصنف، ڈرامے کے آخری واقعے کے رونما ہونے سے قبل، ایک خواب کی صورت میں، انجام کی پہلے ہی اطلاع دیتے ہیں جب فاطمہ کی ماں سارہ، اپنے شوہر عبد اللہ کو اپنا خواب سناتی ہے۔ کہانی کا اختتام اسی اطلاع کے مطابق ہوتا ہے اور باپ اسی خواب کے تناظر میں سارا کو صبر کے لیے کہتا ہے۔ وہ اپنا خواب اس طرح سناتی ہے:

> "میں نے دیکھا کہ۔۔۔ آندھی کا ایک جھونکا آیا ہے اور ہمارا چراغ طاق سے نکل کر زمین پر گر پڑا ہے۔ فاطمہ ہمارے گھر کا چراغ ہے۔"(۶)

میرزا ادیب، تُرکوں اور عربوں کے ہاں بہادری اور شجاعت کی مثالیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں سے متعلق، بہادری اور حب الوطنی کے قصے بیان کرتے ہیں۔ ان قصوں میں حب الوطنی کے علاوہ محلات کی سازشیں، شہزادوں کی آپس میں رقابت، بادشاہوں کی بیویوں کے مابین رقابت، خود غرضی، ہندوؤں کی لُوٹ مار اور انگریزوں کی عیاری پر مبنی تصویریں بھی ملتی ہیں جن سے مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس تناظر میں لکھے گئے ڈراموں میں؛ "حضرت محل"، "موت کے سامنے" اور "ایک صبح" خاص طور پر اہم ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ مشہدی، تاریخی کہانیوں سے جڑے تقاضوں کی بابت لکھتی ہیں:

> "تاریخی کہانیوں کی خوبی کی جانچ کا معیار یہ ہے کہ وہ بچوں میں کہانی کے ہیرو اور متعلقہ عہد سے دلچسپی پیدا کرے۔ انھیں اس ماحول میں لے جائے جس کے متعلق کہانی لکھی جارہی ہے۔ واقعات دلچسپ اور کردار پر کشش ہوں۔ زبان بھی صاف اور شگفتہ ہو۔ تب ہی بچے ان کہانیوں میں دلچسپی کا مظاہرہ کرسکتے ہیں۔"(۷)

اس رائے کی روشنی میں دیکھا جائے تو میرزا ادیب کی تاریخی کہانیاں، اس معیار پر پورا اترتی ہیں کیوں کہ یہ کہانیاں، مقصدیت اور فن کے امتزاج سے جنم لیتی ہیں۔ "حضرت محل"، فکری وفنی اعتبار سے مضبوط ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں اودھ کے بادشاہ، نواب واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کی بہادری اور جرأت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انگریز، نواب واجد علی شاہ کو شکست دے کر کلکتے کے ایک مقام مٹیا برج میں قید کر لیتے ہیں تو اس کی بیگم حضرت محل کے علاوہ کوئی بھی انگریزوں سے لڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا کیوں کہ نواب واجد علی شاہ کی دوسری بیگم فرخندہ محل سمیت بہت سے لوگ سازشیں کرتے ہوئے انگریز جنرل اوٹرم کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اتفاق واتحاد کا فقدان اور نفاق انھیں بکھیر دیتا ہے۔ محل پر حملہ ہوتا ہے تو حضرت محل اپنے دس سالہ بیٹے برجیس قدر کا خیال کیے بغیر محل کی حفاظت کے لیے باہر چلی جاتی ہے اور بیٹے کی حفاظت کی ذمہّ داری علی احمد کو سونپتی ہے مگر فرخندہ محل دوسرے سپاہیوں کی مدد سے علی احمد کو زخمی کر کے برجیس قدر کو جنرل اوٹرم کے پاس لے جانے کے لیے بھیج دیتی ہے لیکن علی احمد بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہزادے کو واپس لے آتا ہے۔

مذکورہ ڈرامے میں بہت سے مقامات پر خارجی تصادم کی صورت نظر آتی ہے۔ حضرت محل اور فرخندہ محل میں رقابت کا رشتہ، تصادم کو جنم دیتا ہے۔ حضرت محل حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے جب کہ فرخندہ محل، جنرل اوٹرم کے ساتھ مل کر سازش کرتی ہے۔ وہ بہت سے دوسرے سپاہیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتی ہے۔ نواب واجد علی شاہ کے چلے جانے کے بعد اقتدار کی خواہش بھی تصادم کو جنم دیتی ہے۔ حضرت محل، سلطنت کی نگرانی کسی اور کے سپرد نہیں کرنا چاہتی کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ یہ لوگ سازشیں کر کے سلطنت کو نقصان پہنچائیں گے چناں چہ وہ چاہتی ہے کہ شہزادے برجیس قدر کو سلطنت کا بادشاہ بنائے اور خود اس کی نگرانی کرے جب کہ فرخندہ محل کو یہ بات بالکل پسند نہیں آتی۔

حضرت محل کے ساتھ اُس کی رقابت ڈرامے کی ابتدا میں ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے جب حضرت محل، شہزادے برجیس کو سمجھاتی ہیں کہ فرخندہ محل بھی تمھاری امی جان ہیں اور شہزادہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ ڈرامے میں اس ابتدائی تعارف کے بعد جب وہ حضرت محل سے اس کے اصل نام، "امراؤ خانم" کے ساتھ مخاطب ہوتی ہے تو یہ تصادم واضح ہو جاتا ہے۔ ان کے مابین مکالمے کی صورت ملاحظہ ہو:

فرخندہ محل :امراؤخانم!

حضرت محل :شکریہ فرخندہ محل۔ آج تم نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا ہے۔ میں حضرت محل نہیں امراؤخانم ہوں۔

فرخندہ محل :امراؤخانم کہہ کر اس لیے پکارا ہے کہ تمھیں اپنی وہ اوقات یاد آجائے جو تم بھول گئی ہو۔

حضرت محل :بہن! تمھیں میری اوقات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کیا تھی اور کیا بن گئی ہوں۔ میں بالکل معمولی لڑکی تھی۔ نواب واجد علی شاہ نے مجھے ذرے سے ستارہ بنادیا ہے۔

فرخندہ محل :جب تک نواب واجد علی محل میں رہے تم کو بات کرنی تک نہیں آتی تھی وہ دیس سے نکال دیے گئے تو تم نے سمجھ لیا کہ اب تم سارے اودھ کی حکمران بن گئی ہو اور جو چاہو کر سکتی ہو۔ تمھیں ہر قسم کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔(۸)

مکالمے کی یہ صورت، دونوں کرداروں کے درمیان رقابت اور تصادم کو ظاہر کرتی ہے۔ فرخندہ محل، اقتدار کی خواہش تو رکھتی ہے مگر جب حضرت محل کے شہزادے کی کم سنی کے سبب اقتدار کی سرپرستی کے لیے اُسے پیش کش کرتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ تمھیں ہر حالت میں اپنے وطن کو غلامی سے بچانا ہو گا تو فرخندہ محل جواب میں کہتی ہے کہ میں اتنی پاگل نہیں کہ جلتی آگ میں کود پڑوں اور جنرل اوٹرم کے بارے میں مثبت باتیں کر کے اُسے بھی وطن کی حفاظت کے جذبے سے دستبردار ہونے کو کہتی ہے۔ حضرت محل کو کمزور کرنے کے لیے شہزادے برجیس قدر کو جنرل اوٹرم کے پاس بھیجتی ہے تاکہ حضرت محل کو ماتا کے جذبے کی یاد دلا کر وطن کی حفاظت سے باز رکھا جاسکے لیکن حضرت محل اس سازش کا شکار نہیں ہوتی۔ کہانی کا اختتام اس اعلان پر ہوتا ہے کہ شہزادہ برجیس قدر اودھ کا حکمران ہو گا اور حضرت محل شہزادے کی سرپرستی کرے گی۔

میرزا ادیب نے اس ڈرامے میں کردار سازی اور مکالمہ نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ کرداروں کی شخصیت کی مختلف جہتوں اور نفسیات کو مدنظر رکھا ہے۔ حضرت محل، بہ یک وقت ماں، اودھ سلطنت کی ملکہ اور بہادر اور نڈر سپاہی کے روپ میں نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں اس کے مکالمے اور کردار سازی، اس کی تمام حیثیتوں کو واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ فرخندہ محل کا کردار، محلاتی سازشوں اور رقابت کی آگ میں جلنے والی عورت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جس میں وطن سے محبت کا جذبہ مفقود ہے۔ یہ کردار قاری کے ذہن میں حضرت محل کے کردار کو ابھارنے میں معاونت کرتا ہے کیوں کہ فرخندہ محل کی شخصی کمزوریوں کے سامنے حضرت محل کے کردار کی سنجیدگی اور پختگی نکھر کر سامنے آتی ہے۔ علی احمد کا کردار ایک بہادر، کہنہ مشق، فرض شناس اور وفادار سپاہی کا کردار ہے جو اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے اپنی جان کو ہر طرح کے خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ وہ باتدبیر اور دور اندیش ہے جو حضرت محل کو محل میں ہونے والی سازشوں اور سپاہیوں کی صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے۔ میرزا ادیب نے ان کرداروں کی پیش کش اور مکالموں کی ادائیگی میں شاہی حفظِ مراتب کا بھی خیال رکھا ہے۔

ڈراما "موت کے سامنے" احمد نگر کی حکمران چاند بی بی، کی تاریخی کہانی ہے، جو نہایت بہادر اور نڈر حکمران ہے۔ وہ مغل فوجیوں کے سپہ سالار خانِ خاناں کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ سپاہیوں کو قلعے کی دیواروں کی کڑی نگرانی کا حکم دیتی ہے کہ جہاں کوئی شگاف پڑے، اُسے فوراً پُر کر دیں۔ رات کے وقت دیوار میں ایک بڑا شگاف دیکھنے پر خود اس شگاف میں کھڑی ہو جاتی ہے تا کہ کہیں دشمن کی نظر اس شگاف پر نہ جائے۔ سپاہی زخمی حالت میں اُسے باہر نکالتے ہیں اور شگاف پُر کرنے لگتے ہیں۔ خانِ خاناں کو بھیجے جانے والے پیغام سے اس کے جذبۂ آزادی کے لیے عزم کا اظہار ہوتا ہے:

> "کیا خان خاناں نے عورت کو اتنا کمزور سمجھ رکھا ہے کہ وہ وطن کی حفاظت کے لیے میان سے تلوار نہیں نکال سکتی! یہ تلوار چاند بی بی کی تلوار ہے جو احمد نگر کی آزادی کی نگہبان ہے اور جو احمد نگر کی آزادی کے دشمنوں پر بجلی بن کر گر سکتی ہے۔ جاؤ اپنے آقا کو بتا دو کہ وہ چاند بی بی کو ایک کمزور عورت نہ سمجھے۔ چاند بی بی کے ہاتھ میں جب تک یہ تلوار چمک رہی ہے۔ اس مقدس قلعے میں کسی حملہ آور کا ناپاک قدم ہر گز نہیں آسکتا۔"(۹)

ڈراما، "جنرل بخت خاں"، مغلیہ خاندان کے آخری حکمران بہادر شاہ ظفر کی کہانی ہے۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ ایسے میں بادشاہ بہت مایوس ہوتا ہے۔ مایوسی کے عالم میں جنرل بخت خاں، بادشاہ کو اُمید دلاتا ہے کہ وہ اپنے خون کا ایک ایک قطرہ، ملک کی آزادی کے لیے بہادے گا مگر وطن کو انگریزوں کی غلامی میں ہر گز نہیں دے گا۔ بادشاہ اس بہادر اور نڈر سپاہی پر اعتماد کرتا ہے اور اُسے اپنی شاہی تلوار پیش کرتا ہے کیوں کہ وہ اُسے اس تلوار کا حقیقی وارث سمجھتا ہے۔ بادشاہ، بخت خاں کو شاہی فوج کا سپہ سالار بنا کر فوجی معاملات میں با اختیار بناتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے بیٹے ، اقتدار کے حصول کی خاطر آپس میں جھگڑتے ہیں اور جب اُنھیں پتہ چلتا ہے کہ جنرل بخت خاں، فوج کا سپہ سالار ہے اور انھیں اس کی پیر وی کرنا ہو گی تو وہ اس کے ماتحت کام کرنا قبول نہیں کرتے۔ جنرل بخت خان کے بہت سمجھانے کے باوجود، وہ اپنی ضد پر قائم رہتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر، فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر کے محض ایک حصہ، بہادر جرنیل بخت خان کی کمان میں دیتا ہے جس کے سبب جنرل بخت خاں، اپنی جنگی بصیرت اور شجاعت کے جوہر نہیں دکھا پاتا اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مغل حکومت کا آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔

مذکورہ ڈرامے کا مرکزی کردار، جنرل بخت خان ہے جس کے اندر بہادری، شجاعت و خود داری اور جنگی بصیرت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہے مگر بادشاہ کے بیٹے اس کے کی جنگی حکمت عملی کی راہ رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ کردار اتنا نڈر ہے کہ بادشاہ کو مخاطب کر کے اس کی وہ غلطیاں گنواتا ہے جو اس کی سلطنت کے زوال کا سبب بنیں۔ شہزادوں کو بار بار سمجھاتا ہے کہ اگر ملک ہی نہ رہا تو حکومت کیسے حاصل ہو گی مگر شہزادے اس کی ایک نہیں سنتے اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کا کردار، ایک بے بس اور مایوس بادشاہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جنرل بخت خاں اور شہزادے میرزا مغل کے درمیان کش مکش، ڈرامے میں تصادم کی صورت پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں ڈراما، المیہ انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسد اریب، میرزا ادیب کے ڈراموں کی انفرادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میرزا ادیب کے لکھے ہوئے ڈرامے بچوں کے لیے آسان بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ انھیں بچوں کے لیے ڈرامے لکھنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ خاص طور پر تاریخی واقعات سے اخذ کیے ہوئے ان کے ڈرامے بہت اچھے ہیں۔"(۱۰)

میرزا ادیب ہندوستان کی سرزمین سے جُڑے تاریخی واقعات اور تاریخی کرداروں کے وسیلے سے کہانی کا تانا بانا بُن کر بچوں میں شجاعت، دلیری اور جذبۂ حب الوطنی پیدا کرتے ہیں۔ اس تناظر میں لکھے گئے ڈراموں سے مسلمانوں کی صفوں میں پیدا ہونے والا نفاق، اتحاد کے فقدان اور غداری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال نمایاں ہوتی ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل، انگریز اپنی عیاری اور ہندو اپنی شاطری ولوٹ مار کے ذریعے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ڈراما "ایک صبح" اسی نکتۂ نظر کا حامل ڈراما ہے جس کا مرکزی کردار، بنگال کے ایک گاؤں "باری سات" کا ایک غریب کاشت کار، لال میاں ہے۔ جو ہندو مہاجن بشن داس کی روالُوٹ مار سے بہت پریشان ہے کہ جس طرح اُس نے دوسرے کسانوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے کہیں اس کی زمینیں بھی نہ چھین لے۔

لال میاں کی بیوی صادقہ اور بیٹی امینہ بھی اس خدشے کے پیشِ نظر بہت پریشان ہوتے ہیں اور لال میاں کو مشورہ دیتے ہیں کہ غلام معصوم شاہ سے بات کریں کیوں کہ وہ غریبوں کا بہت ہمدرد ہے۔ مہاجن اور انگریز دونوں اس سے ڈرتے ہیں مگر لال میاں اس بات پر راضی نہیں ہوتا اور کہتا ہے کہ میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا، کیا پتہ کہاں ہے؟ اسی اثنا میں لال میاں کا دوست راجو، اسے کہتا ہے کہ کمپنی بہادر کا بڑا انگریز افسر تم سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر لال بادشاہ بہت خوش ہوتا ہے۔ انگریز افسر اُسے یقین دلاتا ہے کہ بشن داس اس کی زمینوں کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ مزید یہ کہ اُسے پندرہ ہزار روپے ملیں گے اور وہ جھونپڑی کی بجائے بنگلے میں رہے گا۔ لال میاں یہ سُن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ انگریز افسر اس کے سامنے ایک شرط رکھتا ہے کہ اس کے صلے میں اُسے، اس کا ایک کام کرنا ہو گا۔ انگریز اور ہندو، دونوں غلام معصوم شاہ کو پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ وہ مسلمانوں کو ان کی شاطری سے بچا کر ان کے حقوق کے لیے لڑتا تھا چنانچہ وہ انگریز افسر، لال میاں کو ایک خنجر دیتا ہے کہ وہ غلام معصوم شاہ کو قتل کر دے۔ انگریز افسر کے جانے کے بعد لال میاں کی بیوی اور بیٹی باہر آتے ہیں اور اُسے قتل سے باز رہنے کے لیے کہتے ہیں۔ اسی تکرار کے دوران ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔ لال میاں کے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ وہ غلام معصوم شاہ ہے اور اس کی موت سے اگر اس کی مصیبت دور ہوتی ہے تو وہ مرنے کے لیے تیار ہے۔ لال میاں شرمندہ ہو جاتا ہے اور غلام معصوم شاہ سے معافی مانگ کر اس کا غلام بن جاتا ہے۔ غلام معصوم شاہ، ہندو مہاجنوں اور انگریزوں کے مسلمانوں کے ساتھ رویے کی اس طرح قلعی کھولتا ہے:

"لال میاں! یہ مصیبت صرف تمھاری مصیبت نہیں ہے۔ ان لاکھوں غریبوں کی مصیبت ہے جو تمھاری طرح غریبی کی چکی میں پِس رہے ہیں کیوں کہ انھیں ہندو مہاجن اور انگریز دونوں لوٹ رہے ہیں۔ دونوں ہمارے وطن کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ دونوں نے غریبوں کی زندگی حرام کر دی ہے۔"(۱۱)

یہ ڈراما قیامِ پاکستان سے قبل مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے مظالم کا بہترین عکس پیش کرتا ہے کہ کس طرح انگریز اور ہندو مہاجن، غریب کاشت کاروں کی زمینیں ہتھیا کر انھیں پریشان کرتے تھے اور جو کوئی ان مظالم کے خلاف آواز بلند کرتا اُسے کسی مسلمان ہی کے ہاتھوں راستے سے ہٹا دیا جاتا۔ ڈرامے میں غلام معصوم شاہ کا اچانک لال میاں کے گھر آ جانا، ڈرامے کو حیرت انگیز مقام پر لے آتا ہے اور لال میاں کا ذہن تبدیل ہو جانا، قاری کو اطمینان سے دوچار کرتا ہے۔ ڈراما "تیطو میر" کا موضوع بھی انگریزوں کے تسلط سے آزادی ہے، جس کی خاطر ایک محب وطن مجاہد تیطو میر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔

میرزا ادیب بچوں میں وطن سے محبت کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے قیامِ پاکستان کے بعد رونما ہونے والی پاک بھارت جنگ کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ ڈراما "وطن کی پکار" (۱۲) ۱۹۶۵ء کی پاک بھارگ جنگ کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ جس میں دو کم سن بہن بھائیوں؛ شاہینہ اور گڈو کے جذبۂ حب الوطنی کا اظہار ملتا ہے جو جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہیوں کو خُون دینا چاہتے ہیں مگر والدین اور خود بلڈ بنک والے اُن کی کم سنی کے سبب، اُن کا خون لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ گڈو کا دوست انور اور اس کی بہن، وطن کے لیے چندہ جمع کرتے ہیں۔ شاہینہ اور گڈو، دونوں اپنے جمع کردہ پیسے وطن کی خاطر چندے میں دے دیتے ہیں۔ ان کا خالہ زاد بھائی نثار، وطن کے لیے لڑتے ہوئے زخمی ہو جاتا ہے اور ہسپتال میں زیر علاج ہوتا ہے۔ شاہینہ گھر میں بتائے بغیر اکیلی ہسپتال پہنچ جاتی ہے اور خون دینے کے لیے نرس کو اصرار کرتی ہے۔ سپاہی نثار اس کا یہ جذبہ دیکھ کر اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ جس ملک کے کم سن بچے، جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوں، دشمن اس وطن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

پاکستان سے محبت، قومی پرچم، قومی ترانے اور قائداعظم سے عقیدت اور جذبۂ شہادت سے سرشاری، میرزا ادیب کے ڈرامے "پرچم" میں بھی ملتی ہے۔ یہ ڈراما، پاکستانی سپاہی جعفر شہید کے گھر کی کہانی ہے۔ جعفر شہید نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چھمب کے مقام پر پرچم لہراتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ شہید باپ کے دونوں بیٹے اور بیوی، باپ کی شہادت پر فخر کرتے ہیں اور بڑا بیٹا اختر بھی بھارت کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ اس کی شہادت کے موقع پر آٹھ سالہ بیٹا ناصر بھی جذبۂ شہادت کا اعادہ کرتا ہے۔ میرزا ادیب، شہید باپ اور شہید بیٹے کی کہانی کے ذریعے پاکستانی بچوں میں وطن کی محبت کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔ ڈراما "وطن کی پکار" (۱۳) اور "پیاسا آدمی" بھی اسی موضوع سے متعلق ڈرامے ہیں۔

میرزا ادیب نے فلسطین کی آزادی کو بھی اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے۔ فلسطینی مسلمان، یہودی غاصبوں کو نکالنے کے لیے اس امید کے ساتھ اپنا خون بہا رہے ہیں کہ ان کی قربانی ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائے گی کیوں کہ شہیدوں کا لہو کبھی ضائع نہیں ہو سکتا اور ان کے مقدس لہو میں یہودیوں کا ظلم و ستم بہہ کر نیست و نابود ہو جائے گا۔ "وطن کی خاطر" اسی تناظر میں لکھا گیا خوبصورت ڈراما ہے جو کہانی کی بُنت، پیش کش، کردار نگاری اور مکالمے، ہر اعتبار سے مضبوط ڈراما ہے، جس میں فلسطینی مدرس، سلمان ملجاوی اور اس کی بیوی سمیرہ کا بیٹا فلسطین کی آزادی کے لیے جاری تحریک میں حصہ لینے کے سبب شہید ہو جاتا ہے اس کے باوجود، وہ فلسطین کی مجاہدہ؛ فاطمہ برناوی کو بچانے کے لیے اپنی بیٹی ذکیہ کی قربانی دے دیتے ہیں اور اس بات پر خود کو خوش نصیب تصور کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی؛ دونوں کو وطن کی خاطر قربان کر دیا ہے۔ ذکیہ کی ماں سمیرہ کے جملے اس حوالے سے ملاحظہ ہوں:

"ہم خوش نصیب ہیں۔۔۔۔۔ ہم نے اپنے بیٹے۔۔۔۔۔ اور اپنی بیٹی کو۔۔۔ اپنے وطن پر قربان کر دیا ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں۔۔۔ اللہ ہمیں صبر دے۔۔۔ صبر دے۔"(۱۴)

بچوں کو، شجاعت، دلیری اور وطن کی آزادی کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے وہ ہندوستان کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں آزادی کے لیے ہونے والی جدوجہد اور حُب الوطنی پر مبنی قصے بھی پیش کرتے ہیں۔ فلسطین کے علاوہ الجزائر میں تحریکِ آزادی کے حوالے سے قصے بھی بیان کرتے ہیں۔ ۱۹۵۹ء سے قبل، یہ آزاد ملک، فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا جسے آزاد کروانے کے لیے وہاں کے مسلمانوں نے بہت قربانیاں دیں۔ ڈراما "باپ اور بیٹا" اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس ڈرامے کا پلاٹ انتہائی دردناک ہے۔ یوسف، الجزائر کا ایک مجاہد ہے جو ملک کی آزادی کے لیے تحریک چلاتا ہے اور منصور اندھے فقیر کے بھیس میں، اس تحریک کی معاونت کی غرض سے پیغام رسانی کا کام کرتا ہے۔ فرانسیسی، یوسف کو پکڑنے کے لیے بھاری انعام کا اعلان کرتے ہیں۔ منصور کا بیٹا ناصر، باپ کو دھوکا دیتا ہے کہ وہ بھی فدا کاروں میں شامل ہو گیا ہے مگر جب یوسف ان کے گھر آتا ہے تو وہ انعام کے لالچ میں فرانسیسی سپاہیوں کو یوسف کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سپاہی وہاں پہنچ کر منصور اور یوسف کو پکڑ لیتے ہیں۔ منصور، سپاہیوں کے سامنے ڈراما کرتا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے ناصر سے گلے ملنا چاہتا ہے کیوں کہ جانے وہ آئندہ اپنے بیٹے سے مل سکے گا یا نہیں اور جب گلے ملتا ہے تو جیب میں سے پستول نکال کر اپنے بیٹے ناصر پر گولیاں برسا کر مار دیتا ہے۔ یوسف، منصور سے کہتا ہے کہ یہ تو نے کیا کیا؟ اپنے بیٹے کو مار دیا تو منصور کا جواب، ایک مضبوط باپ اور پُر جوش مجاہد کیروپ میں سامنے آتا ہے۔ اس کے ادا کردہ جملے دیکھیں، جن میں آزادی کے لیے جوش اور جنون نمایاں ہے:

"اپنے بیٹے کو نہیں۔۔۔ وطن کے مجرم کو مارا ہے۔ زندہ رہ کر وہ اور ایسی حرکتیں کر سکتا تھا۔ چلو فرانسیسی ظالمو! کہاں لے جانا چاہتے ہو، لے چلو! اب مجھے کوئی فکر نہیں۔۔۔ کوئی خدشہ نہیں ہے۔"(۱۵)

میرزا ادیب کے وہ تمام ڈرامے، جو کسی تاریخی واقعے، تاریخی کردار، شجاعت، جرأت اور جذبۂ حب الوطنی پر مبنی ہیں، انھیں اپنے موضوع اور ڈرامے کے فن، ہر دو اعتبار سے اُن کے ڈرامائی سرمایے میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ قاری میں جذبۂ ترحّم اُبھارنا، ڈرامے کی اہم خوبی سمجھی جاتی ہے اور جو ڈراما قاری میں جتنا زیادہ یہ جذبہ پیدا کرتا ہے، وہ ڈراما اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ میرزا ادیب کے اس نوعیت کے تمام ڈراموں میں یہ عنصر نمایاں ہے۔ قاری ان ڈراموں کو پڑھتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا اور ڈرامے میں پیش کردہ کرداروں کو مثال بناتے ہوئے اپنے اندر ان جذبات کو تر و تازہ محسوس کرتا ہے۔ ان ڈراموں کے کردار اور مکالمے؛ کہانی کے ساتھ ایسی موافقت رکھتے ہیں کہ قاری بہت دیر تک ڈرامے کے سحر میں مبتلا رہتا ہے۔

میرزا ادیب نے بچوں کے لیے جو ڈرامے لکھے اُن میں ایک بڑا حصہ بچوں کی ذہنی، اخلاقی و معاشرتی تربیت اور ان کی تفریحِ طبع سے متعلق ہے کیوں کہ وہ مثبت اقدار کی اشاعت کے ذریعے معاشرے کو صحت مند بنیادوں پر استوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ معاشرتی خوش حالی کے لیے معاشرے کا انصاف کی بنیادوں پر قائم ہونا ضروری ہوتا ہے اور جس معاشرے کی بنیاد عدم انصاف پر ہوتی ہے وہاں بہت سی اخلاقی و معاشرتی برائیاں جنم لیتی

ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ڈراموں کے ذریعے بچوں کے ذہن میں انصاف کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں۔اس تناظر میں لکھے گئے ڈراموں میں "بادشاہ اور قاضی"، "انصاف" اور "قاضی صاحب کی عدالت میں"، شامل ہیں۔ڈراما "بادشاہ اور قاضی" میں بنگال کے ایک بادشاہ سلطان غیاث الدین اور قاضی کے مثالی انصاف پر مبنی انتظامِ سلطنت کو پیش کیا گیا ہے جہاں بادشاہ کے خلاف مقدمہ چلانے اور تفتیش کرنے میں بھی کوئی تامّل نہیں برتا جاتا ۔بادشاہ، قاضی کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے پوری طرح بااختیار بناتا ہے اور بادشاہ اتنا منصف مزاج ہے کہ خود کو بھی عدالت کے کٹہرے میں پیش کر دیتا ہے۔جنگل سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے انور کو اتفاق سے سلطان غیاث الدین کا تیر لگ جاتا ہے جو جنگل میں ہرن کا شکار کرنے آتا ہے۔انور زخمی ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے تو بادشاہ خود کو اجنبی ظاہر کرتے ہوئے لڑکے کو اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے اور رات بھر اس کی تیمارداری کرتا ہے۔انور کی ماں بہت دکھی ہوتی ہے بادشاہ اُسے سمجھاتا ہے کہ تم اس بادشاہ کے خلاف قاضی کو درخواست دو۔ماں درخواست دینے کی ذمہّ داری خود اِسی کو سونپتی ہے اور وہ قاضی کے پاس شکایت جمع کروا دیتا ہے۔عدالت میں مقدمہ چلتا ہے تو بادشاہ اپنی بجائے اپنے وزیر کو بھیجتا ہے تا کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔قاضی پورے انصاف کے ساتھ حالات وواقعات سنتا ہے جس کے مطابق انور یہ بتاتا ہے کہ بادشاہ شکار کے لیے آیا تھا اور اتفاق سے اس کا تیر ہرن کو لگنے کی بجائے اُس کو لگ گیا۔قاضی فیصلہ سنانے کے لیے بادشاہ کو عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیتا ہے ۔بادشاہ جب کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے تو ماں بیٹے کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا ہے کہ یہ وہی اجنبی ہے جو انور کو گھر لے کر آیا اور رات بھر دل وجان سے اس کی تیمارداری کی اور ماں کی شکایت کو خود قاضی تک پہنچایا۔یوں میرزا ادیب اس ڈرامے کی صورت میں مثالی ریاست، مثالی بادشاہ اور قاضی کا تصور دیتے ہیں۔

ڈراما "انصاف" میں اندلس کے حاکم خلیفہ المنصور کے مثالی انصاف کی کہانی رقم ہے، جو اندلس کے دو تاجروں؛ جبار اور جلیل کے مقابلے میں، اُن کے ملازم کو اشرفیوں کا حق دار ثابت کرتے ہیں۔اسی طرح ڈراما "قاضی صاحب کی عدالت میں" شاہجہاں کے مثالی انصاف پر مبنی کہانی ہے۔اکبر نامی لڑکا شاہجہاں کے درباری نواب زین خاں کے پاس ملازم تھا جسے نواب صاحب کے پاس تین ماہ کام کرنے کے بعد دو ماہ کی تنخواہ تو مل گئی باقی ایک ماہ کی تنخواہ مانگنے پر نواب زین اُسے بے عزت کر کے برخاست کر دیتا ہے۔لڑکے کی بوڑھی ماں، بادشاہ کے پاس شکایت لے کر جاتی ہے تو بادشاہ اُسے قاضی کے پاس جانے کے لیے کہتا ہے اور جب مقدمہ چلتا ہے تو بھیس بدل کر خود عدالت میں آتا ہے تا کہ دیکھ سکے کہ ایک بڑے آدمی کے مقابلے میں وہ ایک غریب لڑکے کے ساتھ انصاف کرتا ہے یا نہیں اور خود بھیس بدل کر عدالت میں گواہی کے لیے آتا ہے۔قاضی کو ناانصافی کرتے دیکھ کر یہ انکشاف کرتا ہے کہ وہ قاضی کے انصاف کو آزمانا چاہتا تھا۔اس کے بعد وہ خود لڑکے کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے نواب کو سزا دیتا ہے اور لڑکے کے لیے محل میں ملازمت کا انتظام بھی کرتا ہے۔یوں ڈراما طربیہ انجام کو پہنچاتا ہے۔میرزا ادیب، انصاف کے ان مثالی تقاضوں کے ذریعے بچوں کو انصاف کی قدر واہمیت سے آگاہ کرتے ہیں۔ڈراما "ایک مقدمہ" میں ایران کے بادشاہ، شاہ عباس کی منصف مزاجی اور حکمت عملی کے بیان کے ذریعے امانت داری کا سبق دیا ہے۔اسماعیل نامی سوداگر، اشرفیوں کی تھیلی اپنے دوست رضا کے پاس بہ طور امانت رکھواتا ہے۔رضا کمال

مہارت کے ساتھ اس میں سے اشرفیاں نکلوا کر اُسی کاریگر سے تھیلی سلواتا ہے جس سے اسماعیل نے سلوائی تھی۔ اسماعیل جب تھیلی کا وزن کم محسوس کرتا ہے تو مقدمہ بادشاہ، شاہ عباس کی عدالت میں پیش ہوتا ہے جہاں بادشاہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے انصاف کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

میرزا ادیب ڈراموں کے وسیلے سے بچوں کو تمدنی زندگی کے اصول بھی سمجھاتے ہیں کہ معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے اور دوستوں کو مشکلات میں دیکھتے ہوئے ان کی مدد میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھنا چاہیے۔ ڈراما "یہ گھڑی تمھاری نہیں" فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ڈراما ہے جس میں بارہ سال کے لڑکا نسیم کے دوست خالد کی بس میں جیب کٹ جاتی ہے، جس میں اُس کی فیس کے پیسے ہوتے ہیں۔ نسیم، والدین کو بتائے بغیر اپنی قیمتی گھڑی بیچ کر اُس کی فیس کا انتظام کرتا ہے اور اس کی بہن عذرا کی نشان دہی پر والدین کو یہ بات پتہ چلتی ہے کہ نسیم کی کلائی میں گھڑی نہیں۔ ماں کے استفسار پر وہ کچھ نہیں بتاتا اور ایک گھڑی کا انتظام کرتا ہے۔ شام کو ماں باپ کے پوچھنے پر کلائی میں لگی گھڑی دکھاتا ہے جس پر باپ کہتا ہے کہ یہ وہ گھڑی نہیں جو میں نے تمھیں دی تھی۔ نسیم انھیں ساری کہانی سناتا ہے تو وہ دوست کی مدد کرنے پر خوش ہوتے ہیں لیکن کوئی چیز بیچ کر مدد کرنے کے عمل کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے اُسے یہ اعتماد دیتے ہیں کہ وہ اپنا ہر کام ماں باپ کو بتائے تا کہ وہ خود اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ یہاں میرزا ادیب، بچوں کو دوست کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ والدین کو ہر بات سے آگاہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ باپ کا نسیم کو سمجھانا دراصل وہ پیغام ہے جو مصنف، بچوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ باپ، اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

> "تم نے غلطی کی ہے بیٹا۔ پہلی بات یہ ہے کہ خالد تمھارا دوست ہے اس لیے تمھاری طرح ہمارا بیٹا بھی ہے اس کے روپے کھو گئے تھے تو ہم اس کی فیس ادا کر دیتے۔ تم نے ہمیں کیوں نہ بتایا اور دوسری بات یہ ہے بیٹا اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا، اچھا کام اچھے طریقے سے ہی ہونا چاہیے۔ دوست کی مدد بہت اچھا کام ہے مگر اس کے کرنے کے لیے طریقہ بھی اچھا ہونا چاہیے۔"(۱۶)

ڈراما "ماں اور بیٹا" میں دوست پر قدرتی آفت کے آنے پر اُس کے لیے قربانی دینے کا جذبہ نمایاں ہے۔ اشرف کا دوست رزاق اور اس کی ماں سیلاب آنے کے سبب بے سروسامانی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ رزاق اشرف کی عدم موجودگی میں اس کے گھر آتا ہے اور اس کی ماں سے، اپنی ماں کے لیے کھانا لے جانے کے لیے پیسے مانگتا ہے تو ماں اپنے حصے کا کھانا، رزاق کی ماں کے لیے دے دیتی ہے جب اشرف گھر آتا ہے اور اُسے اُس کے دوست کی مشکل اور آزمائش کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو وہ اپنے حصے کا کھانا رزاق کو دے آتا ہے یوں ماں بیٹا خود بھوکے رہتے ہیں اور رزاق اور اس کی ماں کو کھانا فراہم کرتے ہیں۔ اشرف کی ماں کا نیک عمل، بیٹے کے لیے مشعلِ راہ بنتا ہے۔ اشرف، اپنے حصے کا کھانا رزاق کو دینے کے لیے اپنی ماں سے یوں اجازت طلب کرتا ہے:

> "امی آپ اپنا کھانا رزاق کی ماں کو دے سکتی ہیں تو میں اپنی روٹی رزاق کو نہیں دے سکتا۔ وہ کیوں بھوکا رہے۔ امی! میں یہ کھانا لے کر اس کے ہاں جاتا ہوں۔ میں اس کے عزیز کے گھر سے واقف ہوں۔ امی اجازت دیں نا۔ بڑی جلدی واپس آجاؤں گا۔ (امی اشرف کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومتی ہیں)۔"(۱۷)

میرزا ادیب، بچوں کا ادب تخلیق کرتے ہوئے، سیدھے سادے مدرّس یا مبلّغ کے طور پر نظر نہیں آتے بلکہ بچوں کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان پر اپنی بات مسلط کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ایسا اندازِ بیان اپناتے ہیں جو بچوں کے لیے قابلِ قبول اور مؤثر بھی ہو۔ وہ بچوں کی اخلاقی تربیت کرتے ہوئے انھیں اساتذہ کی عزت کی تلقین کرتے ہیں مگر ڈراما "انسپکٹر صاحب آئے ہیں" میں صورتِ حال بہت دلچسپ، مگر ایک فکر انگیز گتھی کو جنم دیتی ہے۔ بچے اپنے اساتذہ کی اخلاقی کمزوریوں کی نہایت دلچسپ انداز میں نقل اتارتے ہیں۔ اساتذہ کے طنزیہ اور حقارت آمیز جملوں کو ادا کر کے اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ گھر کے بڑے بچے، چھوٹے بچوں کو اپنے اساتذہ کی نقل اتارتے ہوئے دیکھ کر انھیں اس بات سے منع کرتے ہیں لیکن ان کی عدم موجودگی میں ان کی ذہانت کو سراہتے ہیں اور خود بھی اپنے اساتذہ کی نقل اتارنے لگتے ہیں۔ اسی اثنا میں اُن کے والد صاحب آ جاتے ہیں جو بچوں کا یہ سارا عمل دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کی اس گستاخی پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے زمانۂ حال اور اپنے زمانے کے شاگردوں میں فرق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس موقع پر مصنف ایک اہم نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ ہم شاگردوں سے اساتذہ کے ادب کی توقع رکھتے ہیں جو برحق ہے مگر کیا اساتذہ کسی اخلاقی دائرے کے پابند نہیں؟ کیا اُن پر لازم نہیں کہ وہ بچوں کی عزتِ نفس کا خیال رکھیں؟ بیٹی رخشندہ کے درج ذیل جملے، مصنف کے اس نکتۂ نظر کی عکاسی کرتے ہیں:

> "ابا جان! آپ کے زمانے کے استاد اپنے شاگردوں سے محبت کرتے تھے۔ انھیں طرح طرح کے ناموں سے نہیں بلاتے تھے۔ انھیں چڑیا گھر کے پنجروں میں نہیں بند کرتے تھے۔ ان کی چیزیں نہیں چھین لیتے تھے۔ شاگردوں کے لباسوں کا مذاق نہیں اڑاتے تھے۔ معاف کیجیے ابا جان۔"(۱۸)

یوں ڈرامے کی ابتدا میں دلچسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں پیش کی جانے والی تفریح ایک سنجیدہ سوال کو جنم دیتی ہے۔ اس سوال کے پس پردہ مصنف کا اساتذہ کے کردار اور اخلاقیات کے حوالے سے عدم اطمینان اور تشویش کا احساس ہے جس کے تحت وہ ملک و قوم کے اساتذہ تک اس بات کو پہنچاتے ہیں۔ اساتذہ کا کردار، بچوں کی تعلیم میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اساتذہ کی شخصیت میں متانت، ہمدردی اور پیار و محبت کے جذبات کا ہونا ضروری ہے۔ ان کا غصیلا اور تحقیر آمیز رویہ، نہ صرف بچوں کے دل میں اُن کی عزت ختم کر دیتا ہے بلکہ اس سے ان کے سیکھنے کا عمل بھی متاثر ہوتا ہے۔ ڈراما "جن ماسٹر" میں دو دوست؛ منیر اور اکبر اپنے اساتذہ کی سختی اور غصے کے سبب ریاضی کے مضمون میں دلچسپی نہیں لے پاتے اور امتحان سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ ایسے میں اُن کے ماموں جن ماسٹر بن کر نہایت شفقت کے ساتھ اور انعامات کا لالچ دے کر انھیں ریاضی میں ماہر بنا دیتے ہیں۔ جن ماسٹر کی حقیقت آشکار ہونے سے پہلے منیر، اپنی والدہ کو اپنے اساتذہ اور جن ماسٹر کے طریقہ تدریس میں فرق بتاتا ہے۔ میرزا ادیب بچوں کی اس رائے کے پس پردہ، اساتذہ کے لیے پیغام پیش کرتے ہیں۔ منیر کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

> "امی! سچ مچ ایسا ہوا تھا جن ماسٹر آیا تھا۔ اس نے کہا تھا میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جن ماسٹر جنوں کے بچوں کو کس طرح پڑھاتا ہے۔ امی! اس نے ہمیں بڑے پیار سے سوال سمجھائے۔ ہمیں بڑی مزیدار ٹافیاں کھلائیں۔ امی اب میں حساب سے نہیں ڈرتا۔ میں پاس ہو جاؤں گا امی۔ اس کا طریقہ ہمارے استاد سے مختلف تھا، اس کی بات میں بڑی شفقت تھی۔"(۱۹)

مصنف، اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ بچوں کے ساتھ مکالمے کے لیے ان کی نفسیات کو سمجھنا ضروری ہے اور غصے کی بجائے پیار و محبت سے، ان سے ہر بات منوائی جاسکتی ہے۔

میرزا ادیب سمجھتے ہیں کہ وہ تمام اخلاقی برائیاں جو ہمارے اساتذہ اور والدین کے کردار اور شخصیت میں موجود ہوتی ہیں وہ اُن کے شاگردوں اور بچوں تک ضرور منتقل ہوتی ہیں۔ خواہ یہ منتقلی، موافقت پر مبنی ہو یا مخالفت ورِدِّ عمل پر۔ بچے، بڑوں سے اثر قبول کرتے ہیں اور اپنے اعمال میں انھی کو دُہراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما "بچوں کی عدالت" کا کردار نیاز، اپنے باپ کو دواؤں کی فروخت میں ناجائز منافع لیتے دیکھ کر خود بھی اپنے دوست کے ساتھ غلط بیانی کرتے ہوئے قلم کی زاید قیمت وصول کرتا ہے۔ اسی طرح ڈراما "گڑیا کا جہیز" میں وہ جہیز کی لعنت کو موضوع بناتے ہیں ۔ بچے جس طرح بڑوں میں جہیز کی برائی دیکھتے ہیں اسی طرح گڑیا گڈے کی شادی میں بھی اس برائی کا عکس پیش کرتے ہیں کیوں کہ والدین جو کچھ کرتے ہیں، اولاد وہی کرتی ہے۔ والدین نیکی کے کام کریں تو ان کی اولاد بھی نیکی کے کام کرتی ہے اور اگر ماں باپ سیدھے راستے سے بھٹک جائیں تو بچے بھی بھٹک جاتے ہیں۔ یوں والدین دوہرا جرم کرتے ہیں کہ خود تو غلط کرتے ہیں مگر اپنی اولاد کو بھی مجرم بناتے ہیں۔ ڈراما "یہ نہیں ہو گا" میں غیبت اور چغلی کے مضمرات سے آگاہ کرتے ہیں۔ "مچھلی کا شکار" میں وہ بچوں کو لاف زنی سے بچنے کی نصیحت کرتے ہیں کیوں کہ اس سے سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ڈراما، "غرارہ سیٹ" کے ذریعے وہ بچوں کو نمود و نمائش اور خود نمائی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ قناعت بیش بہا دولت ہے۔ دوسروں سے مانگ کر زرق برق لباس پہننے سے بہتر ہے کہ سادگی میں زندگی گزاری جائے۔ میرزا ادیب جہاں یہ خیال کرتے ہیں کہ بچے، والدین کے اچھے اور برے دونوں طرح کے اعمال کی نقل کرتے ہیں، وہیں وہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ بعض اوقات بچوں کا کوئی عمل، والدین کو راہِ راست پر لانے کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ ڈراما "وہ ڈاکٹر نہیں تھا" کے مرکزی کردار امجد کی معصومیت اور دوست کی بیماری میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ، اس کے لالچی ڈاکٹر باپ کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ڈاکٹر ہونے کے لیے بنیادی شرط ہمدردی کا جذبہ ہے اور روپے پیسے کا لالچ اس مقدس پیشے کو برائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

میرزا ادیب نے بچوں کے لیے جتنا بھی ادب تخلیق کیا، اس میں بچوں کی کردار سازی کو اولین اہمیت دی اور اُن تمام موضوعات کو اپنے ڈراموں اور کہانیوں میں پیش کیا، جن میں بچوں کی کردار سازی اور اخلاقی و معاشرتی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی تفریح کا سامان بھی موجود ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی دلچسپیوں کا یکساں سامان ملتا ہے۔ خاص طور پر لڑکیوں کا گڑیوں کے ساتھ کھیلنا، ان کی شادی کرنا، شادی کے موقع پر لذیذ کھانے بنانا، گڑیوں کی حفاظت کرنا اور گڑیوں کی بیماری میں خود بھی کھانا پینا چھوڑ دینے کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے کے ڈراموں میں: "بگی کی گڑیا"، "گڑیا کا جہیز"، "کیا لذیز کھانے ہیں"، "دو گڑیاں"، "اور یہ نہیں ہو گا" وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں ، جن میں گڑیا کا کردار، کہانی کا مرکزی نکتہ بنتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کھیل ہی کھیل میں بچوں کو صالح اعمال کی جانب مائل کرنے کے گُر سے بہ خوبی واقف ہیں۔ زندگی کے عام معاملات اور معمولی باتوں کو بھی اہمیت دیتے ہیں کیوں کہ چھوٹی چھوٹی باتیں مل کر کردار کی مکمل شکل بناتی ہیں۔ ڈراما "وہ کون تھا" میں وہ بہن بھائیوں کو آپس میں اتفاق اور محبت سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ "ایسے کو تیسا" میں وہ سمجھاتے ہیں کہ ہر عمل کا

رد عمل ہوتا ہے اور دوسرے کے ساتھ جیسا برتاؤ کرتے ہی، دوسرا بھی ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔ڈراما "گھنٹی کہاں گئی" میں وہ شرارت کے برے انجام سے آگاہ کرتے ہیں۔

میرزاادیب نے بچوں کے ادب کے حوالے سے ایک منفرد تجربہ بھی کیا ہے۔انھوں نے علامہ اقبال کی سات نظموں کی ڈرامائی تشکیل کی ہے۔ان نظموں میں "ماں کا خواب"، "ایک پہاڑ اور گلہری"، "ایک گائے اور بکری"، "ایک مکڑا اور مکھی"، "ہمدردی"، "شعاعِ آفتاب" اور "پھولو ں کی شہزادی" شامل ہیں۔انھی عنوانات کے تحت ڈرامے ترتیب دیے گئے ہیں۔ان ڈراموں کو پنجاب آرٹس کونسل کے تحت اسٹیج بھی کیے گئے جس کے ہدایت کار امجد اسلام امجد تھے۔ان نظموں کے ذریعے وہ شاعر ملت و قوم، علامہ اقبال کی فکر کو بچوں کے لیے انتہائی سہل، سادہ و رواں اور دلچسپ و شگفتہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ان نظموں کی ڈرامائی تشکیل میں کس قدر اضافہ و توسیع کی گئی ہے، اس کی بابت میرزاادیب لکھتے ہیں:

> "نظم پڑھنے کے لیے ہوتی ہے اور ڈراما لکھنے کے ، اس لیے ایک نظم کو ڈراما بنانے کے لیے کچھ نئے واقعات کا اضافہ کرنا پڑتا ہے، کچھ نئے کرداروں کا، کچھ ایسے مکالمے کا جس کی ضرورت ہو۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود نظم کی اپنی روح کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔"(۲۰)

درج بالا تجزیے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ میرزاادیب نے بہ یک وقت بڑوں اور بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا ہے لیکن دونوں کے فکری و فنی تقاضوں کو پوری طرح نبھایا ہے۔ان کے تحریر کردہ یک بابی ڈرامے؛ بچوں کے لیے تعلیم و تربیت کے ساتھ تفریح کا وسیلہ بھی بنتے ہیں۔اسلامی و مشرقی اقدار اور تہذیب و تمدن کی عکاسی، جغرافیائی کوائف، جذبۂ حب الوطنی اور پاکستانیت کا احساس، ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔بچوں کے لیے اُنھوں نے جو کچھ لکھا، وہ تعداد اور معیار؛ ہر دو اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے یہی وجہ ہے کہ انھیں بچوں کے ادب میں امتیازی شناخت کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔:

## حوالہ جات:


۱۔ میرزاادیب، ٹکی گڑیا، لاہور :مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۳۔ میرزاادیب، بچوں کی عدالت، لاہور: مقبول اکیڈمی، س ن، ص ۱۵
مذکورہ ڈراما "قوم کی بیٹی" اُن کے ڈراموں کے مجموعے "قوم کی بیٹی" میں بھی شامل ہے۔ دراصل ڈراموں کے مجموعے "بچوں کی عدالت" اور "قوم کی بیٹی" دونوں میں ڈرامے یکساں ہیں محض ڈراموں کے مجموعوں کے نام مختلف ہیں۔

۴۔ میرزاادیب، وطن کی پکار، لاہور: مقبول اکیڈمی، سن، ص ۷۸

۵۔ ایضاً، ص ۹۲

۶۔ ایضاً، ص ۹۰

۷۔ ڈاکٹر سیدہ مشہدی، اُردو میں بچوں کا ادب، رانچی :ایمن پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۶۹

۸۔ میرزاادیب، وطن کی پکار، ص ۲۷

۹۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۱۔ ڈاکٹر اسد اریب، بچوں کا ادب: تاریخ و تنقید، ملتان: کاروانِ ادب، ص ۱۴۲

۱۲۔ میرزاادیب، وطن کی پکار، ص ۲۰

۱۳۔ یہ ڈراما، میرزاادیب کے ڈرامائی مجموعے "وطن کی پکار" میں شامل آخری ڈراما ہے جس کا نام ابتدائی فہرست میں "وطن کی پکار" درج ہے جب کہ ڈرامے کے متن کے ساتھ "پاکستان زندہ رہے گا" لکھا ہے۔

یہاں ڈراما "وطن کی پکار" سے مراد، میرزاادیب کے ڈرامائی مجموعے "پانچ کھیل" کا پہلا ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کا متن اُن کے ڈرامائی مجموعے "وطن کی پکار" میں موجود ڈرامے کے متن سے یکسر مختلف ہے۔

۱۴۔ میرزاادیب، پانچ ڈرامے، لاہور: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، ۱۹۷۲ء، ص ۶۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۶۔ میرزاادیب، کون ہے فریادی، لاہور: مکتبۂ عالیہ، س ن، ص ۴۱

۱۷۔ میرزاادیب، نانی اماں کی عینک، لاہور: مقبول اکیڈمی، س ن، ص ۸۰

۱۸۔ میرزاادیب، وہ ڈاکٹر نہیں تھا، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۱۴

۱۹۔ میرزاادیب، جن ماسٹر، لاہور: مقبول اکیڈمی، س ن، ص ۷۷

۲۰۔ میرزاادیب، یہ کھیل (دیباچہ) ماں کا خواب، لاہور: مکتبہ اقراء، س ن

☆☆☆☆☆